----- خاکہ ----- | ----- حالی -----

خاکہ کے معنی نقشہ یا لکیروں سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔ ادبی لحاظ سے خاکہ سے مُراد وہ نثری تحریر ہے جس میں مختصر طور پر کسی شخصیت کا ناک نقشہ، اُس کے خیالات، اُس کی طبیعت اور اس کی عادتوں کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ خاکہ نگار کا مقصد پڑھنے والے پر بھرپور تاثر چھوڑنا ہوتا ہے اس لئے وہ متعلقہ شخص کی انفرادی خصوصیات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی منفرد شناخت سامنے آجاتی ہے۔ خاکہ نگار اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربے سے کام لے کر متعلقہ شخص کے کردار کو پیش کرتا ہے۔ اُسے شخصیت کے تمام گوشوں کی نشاندہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خاکہ نگار کا انداز غیر جانب دارانہ ہونا چاہئے ورنہ خاکہ جس صنف کا نام ہے اُس کا حق وہ ادا نہیں کر پائے گا اور متعلقہ شخص کی اصلی تصویر سامنے نہ آپائے گی۔ خاکہ نگار جس طرح کسی شخص کو سمجھتا اور جانتا ہو، اُسے اسی طرح اُس کا صحیح اور ٹھیک ٹھاک نقشہ کھینچنا چاہئے تب ہی وہ ایک کامیاب خاکہ نگار کہلا پائے گا۔

اردو میں خاکہ نگاری کے پہلے نقوش شاعروں کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ ''آب حیات'' میں خاکوں کے ادھورے نقوش ملتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' کو اردو کی پہلی خاکہ نگاری کی کتاب تسلیم کیا گیا ہے فنی طور پر خاکہ نگاری کو رواج دینے والے ادیبوں میں مولوی عبدالحق امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی بہت سے اچھے خاکے لکھے ہیں۔ شرؔر۔ رُسواؔ۔ منٹوؔ۔ شوکت تھانوی اور حسن نظامی کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں نے خاکے لکھے ہیں

----- مولوی عبدالحق ----- (۱۸۷۰ – ۱۹۶۱)

ایک ادبی محقق، خاکہ نگار اور نصابی کتابوں کے مدوّن کی حیثیت سے مولوی عبدالحق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ آپ ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو میرٹھ کے ضلع ہاپڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور وہیں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران آپ کو حالؔی، شبلؔی اور سرؔ سید احمد خان جیسے عالم فاضل لوگوں کی صحبت حاصل رہی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد حیدرآباد میں استاد کی حیثیت سے کام کیا اور ترقی کرتے کرتے انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے۔ جامعہ عثمانیہ کے قائم ہوتے ہی اس کے ناظم مقرر ہوئے، پھر ''انجمن ترقی اردو'' کو منظّم کیا اور ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''اردو'' جاری کیا۔ کچھ عرصہ تک عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل بھی رہے۔ اردو کی خدمت کرتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ الہٰ آباد یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ دلی میں اردو کی تعلیم و ترقی کے لئے آپ نے کتابوں کی اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا لیکن ۱۹۴۷ء کے فسادات میں یہ کام تباہ ہوگیا اور پاکستان چلے گئے۔ وہاں پر بھی آپ نے اردو کی ترقی کے لئے خوب کام کیا۔ آخری عمر میں آپ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں وفات پائی۔

مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کہا جاتا ہے۔ آپ نے تمام عمر اردو زبان کی خدمت میں وقف کردی۔ آپ نے اس زبان میں کئی قابل ذکر تحقیقی کام انجام دئے اور اس زبان کی تصحیح اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کئی برسوں تک آپ سہ ماہی رسالہ ''اردو''

نکالتے رہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین خود بھی لکھتے تھے اور دوسرے اہلِ اردو سے بھی لکھواتے تھے۔ آپ نے کئی قدیم کتابوں کو دریافت کر کے انہیں اپنے دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ شائع کیا۔ ''اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' اور ''مرحوم دلی کالج'' لکھ کر آپ نے ادبی تحقیق کو ترقی دی۔ آپ کو اردو نثر پر زبردست عبور تھا۔ آپ کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ آپ مختصر اور عام فہم جملے استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے اردو قواعد پر ایک معیاری کتاب لکھی اور آپ کا ایک اور بڑا کارنامہ انگریزی اردو لغت ہے۔

۳ ----- سوالات کے جوابات -----

سوال:۱) قومی اتحاد کے بارے میں مولانا حالؔی کا کیا خیال تھا؟

جواب) مولانا حالؔی قومی اتحاد کے زبردست حامیوں میں سے تھے آپ جب بھی تقریر کرتے یا کچھ تحریر میں لاتے تو ہر فرقے کے جذبات کا خیال رکھتے۔ کبھی ہندو مسلم جھگڑے کا کوئی واقعہ سنتے تو آپ کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ آپ ہر قوم و مذہب کے آدمی سے خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔

سوال:۲) مولانا حالؔی نے عملی میدان میں کون سی دو یادگاریں چھوڑی ہیں؟

جواب) مولانا حالؔی نے عملی میدان میں جو دو یادیں چھوڑیں اُن میں پانی پت کا مدرسہ اور دوسری اورینٹل لائبریری کا قیام ہے۔

۴۔ -----نثری اصناف-----

خاکہ نگاری: کسی شخص سے جو ہمارا تعلق اور میل جول ہوتا ہے اُس کی روشنی میں اس کے بارے میں جو کچھ لکھا جائے اُسے خاکہ نگاری کہتے ہیں۔

سوانح نگاری: کسی شخص کے حالاتِ زندگی ترتیب وار لکھنے کو سوانح نگاری کہتے ہیں۔

شخصیت نگاری: کسی شخص کے بارے میں بطور شخص جو ہم جانتے ہیں اُس کو بیان کرنے کو شخصیت نگاری کہتے ہیں۔

۵ ----- سبق میں سے واقعات -----

۱۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں علالت کے سبب مولانا حالؔی نے اپنی نظم وحیدالدین سلیم کو پڑھنے کے لئے دی۔ مولوی صاحب بہت بلند آواز تھے اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک ہی بند پڑھا تھا کہ مولانا حالؔی کھڑے ہو گئے اور مولوی صاحب سے نظم لے کر خود ہی پڑھ ڈالی۔

۲۔ ایک بار مولوی انوار احمد جاڑوں کے موسم میں شام کے وقت مولانا حالؔی کے یہاں پہنچے۔ مولانا نے اُن کی آمد پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ اُن کے کھانے کا بندوبست کیا اور ان کے لئے ملائی منگوائی۔ رات کے بارہ ایک بجے ان کے لئے اپنی چادر لے کر آئے اور ان کو اوڑھایا۔

۳۔ ایک بار جب مولوی عبدالحق اور مولوی حمیدالدین ان سے ملنے کے لئے پہنچے تو مولانا حالؔی ان دونوں کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اِن دونوں صاحبوں نے شرمندگی ظاہر کی تو مولانا حالؔی نے فرمایا کہ تم لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کِن کی کروں۔

۵ ----- اقتباس کا ماحاصل -----

یہ اقتباس مولوی عبدالحق کے خاکہ ''حالی'' سے لیا گیا ہے اس اقتباس میں مولوی عبدالحق مولانا حالی کے خیالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مولانا حالی جدید تعلیم کے حامیوں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی کوشش بھر اس تعلیم کی اشاعت میں حصہ لیا۔ عمر کے آخری دور میں جب وہ علی گڑھ کے طالب علموں کو دیکھتے تھے تو انہیں مایوسی محسوس ہوئی۔ کالج کے رسالہ میں طالب علموں کے ادبی معیار کی گراوٹ کو دیکھتے تو افسوس کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جس ادبی معیار کو قائم رکھنے کی ضرورت تھی اس کو طلباء ختم کرتے جا رہے ہیں اور اس کے بجائے ان کی تحریروں میں تمسخر کے سوا کچھ بھی نہیں رہا ہے۔

۶ ----- خالی جگہیں -----

اقلام ۔ باتیں ۔ راتیں ۔ نظمیں ۔ اوقات ۔ اسباب ۔ افلاک ۔ اطراف

----- الفاظ کی تذکیر و تانیث جملوں سے -----

دہی = دہی بہت کھٹا ہے۔ مالا = موتیوں کی مالا خوبصورت ہے۔ دل = دل جسم کو خون پہنچاتا ہے۔

آبشار = آبشار کا پانی میٹھا ہے۔ برف = برف پگھل رہی ہے۔

----- گرائمر -----

مرکب اشاری: وہ مرکب جو اسم اشارہ اور مُشارُ الیہ سے مِل کر بنے اُسے مرکب اشاری کہتے ہیں۔ مثلاً یہ لڑکا۔ وہ کتاب۔ وغیرہ

اسم اشارہ : یہ وہ اسم ہے جس سے کسی اسم کی طرف اشارہ کیا جائے۔

مُشارُ الیہ : وہ چیز جس کی طرف اشارہ کیا جائے۔

مثلاً	یہ	لڑکا
	اسم اشارہ	مُشارُ الیہ

----- جملوں سے مرکب اشاری -----

وہ کتاب ۔ یہ لڑکا ۔ یہ قلم ۔ وہ پینسل

۷ ----- خالی جگہیں -----

ٹھکرائن ۔ کھترائن ۔ نائن ۔ حلوائن ۔ قصائن ۔ فرنگن

۸ ----- متضاد الفاظ -----

نیچے ۔ تنگ ۔ سخت ۔ رات ۔ آخری ۔ ادنیٰ

----- انشائیہ 'خوشامد' -----

انشائیہ، انشا سے منسوب ہے جس کا مطلب ہے عبارت لکھنا۔ اردو ادب میں انشائیہ سے مُراد نثر کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے بارے میں بے ساختہ اور غیر علمی انداز سے اپنی بات کہتا ہے۔ اردو کی دیگر نثری اصناف کی طرح انشائیہ بھی ایک خاص صنف ہے جس میں مصنف پڑھنے والے کی ذہنی آسودگی اور دلی مسرت کا سامان میسر رکھتا ہے۔ یہ صنف بھی مضمون ہی کی ایک قسم ہے مگر یہ مضمون سے مختلف ہے۔ انشائیہ نگار کے سامنے کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دل کی باتیں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے لیکن ان باتوں میں تازگی کا ہونا لازمی ہے۔ اس میں طنز و مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ اس کا کوئی لازمی جُز نہیں ہے۔ انشائیہ نگار اپنے انفرادی تجربات کو پیش کر کے اپنی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے لئے زبان پر قدرت ہونا لازمی ہے۔ اس صنفِ ادب میں زندگی کے ہر ایک شعبے پر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں مغرب کے اثر سے جن چیزوں کی ابتداء اردو ادب میں ہوئی اُن میں انشائیہ بھی ہے۔ سر سید احمد خان، منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے قلمکاروں کی بعض تحریروں کو انشائیہ نگاری کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اعلیٰ معیار کے انشائیے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ وزیر آغا، حسن نظامی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور کنہیا لال کپور نے اس صنف کی طرف توجہ دی اور کامیاب انشائیے لکھے۔ موجودہ دور کے مسائل کے اظہار کے لئے انشائیہ موزوں ترین صنفِ ادب ہے۔

----- سر سیّد احمد خان ----- (۱۸۱۷ – ۱۸۹۸)

سر سید احمد خان ایک باوقار مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ مصلحِ قوم بھی تھے آپ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کا تعلق مغلیہ سلطنت سے بہت قدیم تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں آپ کی نیک سیرت والدہ کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد صحافت سے جُڑ گئے اور ملازمت کے سلسلے میں آگرہ چلے گئے جہاں نائب منشی کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ترقی کرتے کرتے سب جج کے عہدے تک پہنچے۔ اس دوران آپ کو بادشاہِ وقت کی طرف سے ''عارفِ جنگ'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ تحریکِ آزادی میں گھر بار لٹ جانے سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی۔ اسی تحریک میں کئی انگریز حکمرانوں کی جان بچانے کے عوض انگریز سرکار کے یہاں آپ کی بڑی قدردانی ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں آپ انگلستان چلے گئے اور پھر واپس آنے کے بعد آپ نے مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں آپ نے سب سے پہلے ایک انجمن ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے قائم کی۔ ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں ایک کالج کی بنیاد ڈالی جسے آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آخری عمر تک اسی کالج کی نگرانی کرتے ہوئے تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں ہی وفات پائی۔

سر سید احمد خان بہت اچھے ادیب تھے۔ آپ کی فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ آپ کا تحریر سرمایہ اردو ادب میں خاص مقام رکھتا

ہے۔آپ نے زندگی کے تعلق رکھنے والے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔آپ کی نثر سادہ اور واضح ہے صفائی اور سادگی نے ہی آپ کو جدید انشاپردازی کا موجد بنایا ہے۔'تہذیب الاخلاق' میں مختلف مضامین پر قلم اٹھاتے ہوئے آپ نے انشاپردازی کو بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔آپ نے مغربی خیالات کو اردو زبان میں ادا کر کے اردو ادب اور اردو دان طبقہ کو ان خیالات سے روشناس کرایا۔آپ دلائل پیش کر کے اپنی بات میں مضبوطی لاتے ہیں۔آپ کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ آپ مشکل اور پیچیدہ مضامین کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔جامِ جم، آثارُ الصنادید، اسبابِ بغاوتِ ہند، خطباتِ احمدیہ، رسالہ تہذیب الاخلاق، تصحیح آئینِ اکبری اور تاریخِ بجنور آپ کی قابلِ قدر تصانیف ہیں۔

۳۔ سوالات کے جوابات

سوال ۱) خوشامد کو بدتر چیز کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب) خوشامد کو بدترین چیز اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ یہ گھٹیا جذبہ انسان کے دل میں غرور اور فخر پیدا کرتا ہے۔وہ اپنے دل کی تسکین کے لئے اپنے آپ میں ایسے اوصاف ڈھونڈتا رہتا ہے جو درحقیقت اس میں نہیں ہوتے ہیں۔اُس کی عقل اس گندے جذبے کی غلام ہو جاتی ہے اور وہ اخلاقی طور گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

سوال ۲) خوشامدی میں کیا کیا عیب ہوتے ہیں؟

جواب) خوشامدی مکّاری اور دھوکہ دہی سے کام لیتا ہے۔وہ دوسروں کی جھوٹی تعریفیں کر کے انہیں بے وقوف بناتا ہے اور وہ اپنی اصلیت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔وہ اپنے مطلب اور اپنی غرض کے لئے لوگوں کے جذبات سے کھیلتا ہے اور لوگوں کو بُرے اخلاق کی راہ دکھاتا ہے۔

خلاصہ -----

''خوشامد'' سر سید احمد خان کا لکھا ہوا انشائیہ ہے جس میں آپ نے خوشامد پسندی جیسے گھٹیا جذبے کی برائیاں شمار کی ہیں۔آپ لکھتے ہیں کہ دل کی تمام تر بیماریوں میں سب سے مہلک بیماری خوشامد پسندی ہے جس طرح انسانی بدن وبائی بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے اسی طرح انسان کے دل میں ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جو خوشامد پسندی کی برائی کو جذب کرتا ہے۔آغاز میں ہمیں ہر شئے سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ ہم خود اپنی خوشامد کرنے لگتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ہمیں دوسروں کی خوشامد بھی اچھی لگنے لگتی ہے اور ہم خوشامدیوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔اس طرح ہماری عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ہمیں جب کسی ایسی خوبی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جو ہم میں موجود نہیں ہوتی تو ہم خوشامد کو پسند کرنے لگ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ خوشامدی ہم میں اُس خوبی کی موجودگی کا اظہار کرے۔اس طرح دوسروں کے وصف اور خوبیاں ہم اپنے آپ میں دیکھنے لگتے ہیں جس کسی کی خوشامد کی جاتی ہے اُس میں اچھاپن اور گھٹیا پن آجاتا ہے اس کے برعکس ایک سچی اور واجب تعریف ایک عمدہ خوشبو کی طرح ہوتی ہے اور جب یہ خوشبو کسی کمزور دماغ میں زبردستی ڈال دی جاتی ہے تو یہ ایک تیز بُو بن کر دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔

خوشامد پسندی ایک گھٹیا جذبہ ہے۔اس مرض کے لاحق ہوتے ہی انسان اپنی اصلیت بھول جاتا ہے۔وہ ایسی باتیں سُننے کا

خواہش مند ہوتا ہے جس سے اُس کی جھوٹی انا کو تسکین ملے اور اس کا نفس موٹا ہو۔ جیسے جیسے یہ جذبہ انسان کے اندر مضبوط ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ ذہنی اور روحانی طور پر کمزور ہوتا جاتا ہے۔ وہ خود فریبی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عموماً خوشامد پسندی کا جذبہ اُن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جو عام لوگوں کی سطح سے اوپر ہوتے ہیں یعنی سماج میں جن کو کوئی رُتبہ یا مقام حاصل ہوتا ہے۔ خوشامد گمراہی کی طرف راغب کرتی ہے اور ہمیں ہر گمراہی سے بچنا چاہیے۔

۴۔ ----- اقتباس کے سوالات کے جوابات -----

۱۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال رہتا ہے۔

۲۔ عالی ہمت طبعیت کو مناسب عزت اور سنجیدہ تعریف سے تقویت ملتی ہے۔ ۳۔ پست ہمتی کا سبب غفلت اور حقارت ہے۔

۴۔ لفظوں کے ہم معنی: شہرت = ناموری ۔ سخی = فیاض ۔ طاقت = قوّت

نیچے = پست ۔ موزوں = مناسب ۔ لاپرواہی = غفلت

۵۔ اقتباس کا ماحاصل

یہ اقتباس سر سید احمد خان کے انشائیے ''خوشامد'' سے ماخوذ ہے اس اقتباس میں سر سید احمد خان خوشامد جیسے بُرے جذبے کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شہرت ایک بہترین خوشبو جیسی ہوتی ہے۔ سچی اور مناسب تعریف عمدہ خوشبو کا سا اثر ڈالتی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ خوشبو کسی کمزور اور نااہل دماغ میں زبردستی ٹھونسی جائے تو یہ خوشبو ایک تیز بُو میں بدل کر ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے اور ذہن پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ ایک دریا دل شخص کو بدنامی کے ساتھ ساتھ نیک نامی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ باہمت انسان کی مناسب تعریف کی جائے تو وہ اس تعریف سے مزید قوت حاصل کرتا ہے اور اس کے برعکس غفلت اور حقارت سے وہ کم ہمت ہو جاتا ہے

۶۔ خوش آنے والی چیز

۵ ---- موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ ۶ ---- خوشامد ایک بُری چیز ہے۔

۷ ---- علی گڑھ کالج سر سید احمد خان نے قائم کیا تھا۔ ۸ ---- سر سید نے ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔

۱۰ ۔ **مرکّب جاری**: وہ مرکب جو حرفِ جار اور مجرور سے مل کر بنے مرکب جاری کہلاتا ہے جیسے گھر سے، مسجد تک، شہر میں

حرفِ جار: وہ حروف جو اسم اور فعل کو آپس میں ملاتے ہیں جیسے؛ پر، میں، سے وغیرہ۔

مجرور: جن اسموں اور فعلوں کے ساتھ حروفِ جار لگے ہوں اُن کو مجرور کہتے ہیں۔

مثال:			
مسجد	تک	گھر	سے
مجرور	جار	مجرور	جار

مرکّب جاری: دلی سے، میز پر، کولکتہ تک، کتاب میں، درخت پر

----- عرشؔ صہبائی ----- (۱۹۳۰ –

عرشؔ صہبائی کا پورا نام ہنس راج ابرول تھا۔آپ اکھنور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سہری پلائی میں ۶ ستمبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اکھنور میں ہی حاصل کی۔دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے مزید تعلیم کے لئے جموں کالج میں داخلہ لیا لیکن آپ اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے اور ریڈیو کشمیر جموں میں ملازمت اختیار کی اور وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے اور آج تک اردو شعروادب کی آبیاری کررہے ہیں۔

عرش صہبائی نے اپنی شعری زندگی کا آغاز ۴۸-۱۹۴۷ء سے کیا۔اردو کے مشہور شاعر جوشؔ ملسیانی کی شاگردی اختیار کی اور ۱۹۶۳ء تک اُنہیں سے مشوریِ سخن کرتے رہے۔آپ نے اردو کی اکثر اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن آپ کی شاعری زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔آپ نے ابتداء میں روایتی شاعری کا انداز اپنایا لیکن آگے چل کر آپ نے عصری مسائل کا بھی احاطہ کیا۔آپ کی زبان صاف اور رواں ہے۔سادگی آپ کے کلام کا جوہر ہے۔آپ کی غزلوں میں تاثیر پائی جاتی ہے اس وقت تک آپ کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں: ''شگفت گل'' ، '' شکستِ جام'' اور ''صلیب''۔ان میں سے شگفت گل پر آپ کو ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام بھی ملا۔نثری تصانیف میں ''انجم کدہ'' ، ''یہ جانے پہچانے لوگ'' اور '' مختلف اردو شعراء کے تذکرے'' شامل ہیں۔ان تینوں کتابوں میں آپ نے اپنے ہم عصر شعراء کی حیات اور فن کے بارے میں مختصر ذکر کیا ہے۔

۳۔ ----- سوالات کے جوابات -----

۲۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے،اپنی ذات کی قید سے اس لئے باہر نہ آسکا کیونکہ اپنی ذات سے باہر آنے کے لئے میرے پاس کوئی گنجائش نہیں۔میں باہر جانے سے اس لئے کتراتا ہوں کہ باہر میری ذات کی قید سے بڑھ کر ایک قید ہے۔اس لئے میں اپنی ذات میں قید ہو کر کھو گیا ہوں۔

۳۔ عرشؔ صہبائی کہتے ہیں کہ میرا محبوب میری روح میں بس گیا ہے اس لئے ظاہری طور وہ مجھ سے دور ہے اور مجھے بظاہر نظر نہیں آتا مگر وہ میرے دل میں اور میری روح میں سما چکا ہے اور حقیقت میں وہ میرے بہت قریب ہے۔

غــــــزل نمـــبــر ۱

کون سا وہ زخم دل تھا جو تر و تازہ نہ تھا   زندگی میں اتنے غم تھے جن کا اندازہ نہ تھا

عرشؔ صہبائی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اس زندگی نے مجھے اس قدر غم مصائب اور تکالیف دیئے ہیں جنکا شمار مشکل ہے۔لیکن ہر زخم کی کیفیت ایسی ہے کہ وہ ابھی میرے دل میں بھی تر و تازہ ہے اور مجھے ستا رہے ہیں۔

ہم نکل سکتے بھی تو کیوں کر مصارِ ذات سے   صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

عرش صہبائی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ اپنے وجود میں گم رہا۔کیونکہ میرے چاروں طرف کا ماحول ناپاک اور ناپسندیدہ تھا۔اردگرد ہونے والے ناپسندیدہ واقعات سے کبھی بھی متاثر نہ ہوا۔بلکہ اپنی تہذیب کی پاکیزہ قدروں پر کاربند رہا۔

اُس کی آنکھوں سے نمایاں تھی محبت کی چمک   اُس کے چہرے پر نئی تہذیب کا غارہ نہ تھا

عرشؔ صہبائی اس شعر میں بیان فرماتے ہیں کہ میرے محبوب کی آنکھوں میں پاکیزہ محبت کی چمک اور تابانی تھی۔اس پر مغربی تہذیب کا کوئی اثر نہ تھا۔ عرشؔ ان کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

عرشؔ اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے عرش! محبوب کی جھیل سی آنکھوں کو دیکھکر نہ جانے کتنے لوگ اس کے دیوانے ہوگئے۔لیکن اس میں محبوب کی خوبصورت آنکھوں کا کیا قصور جن کو ان کی گہرائی کا اندازہ نہ تھا وہ دیوانے ہوگئے یا مٹ گئے۔

غــــــزل نمــــبــــر۲

ہر ایک رنگ میں کاٹیں گے ہم سزا ہی سہی یہ زندگی کسی مفلس کی بددعائی سہی

عرش صہبائی اس شعر میں اپنے محبوب سے فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب! میری تقدیر میں صرف غم پریشانی اضطراب اور بے چینی ہے اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر لمحہ پر مجھے غموں اور تکلیفوں سے سابقہ پڑا اس لئے میں اپنی زندگی کو کسی مفلس کی بدُعا کا نتیجہ سمجھتا ہوں کیونکہ مفلس کی دُعا جلد قبول ہو جاتی ہے

نہ اس کو بھول کہ میں نے تجھے کیا تخلیق یہ اور بات ہے تو وقت کا خدا ہی سہی

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ اے وقت کے خدا بننے والے یہ مت بھول کہ تیرا وجود میرے دم سے ہے تو اپنے طاقت کے نشے میں چُور ہے جب کہ حقیقت میں میرے دیوانہ وار محبت کرنے سے تیرے چرچے عام ہوئے ہیں۔

یہی بہت ہے کہ مجھ پر تری توجہ ہے۔ تری نگاہ کا انداز دوسرا ہی سہی

عرشؔ صہبائی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب میرے لئے تمہاری نظر ہی کافی ہے اگر چہ وہ بے رخی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔میں تمہاری ترش نگاہ کو بھی باعث فخر اور باعث مسرت سمجھتا ہوں۔

وہ میری روح میں تحلیل ہو چکا ہے عرشؔ اگر وہ مجھ سے جدا ہے چلو جُدا ہی رکھنا سہی

مقطع کے شعر میں عرشؔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے عرش! میرا محبوب میرے دل و جان اور رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے اگر چہ بظاہر میرا محبوب میرے جسم سے جدا ہی ہے۔لیکن جدا ہونے کے باوجود بھی وہ میرے جسم کا ایک حصہّ بن گیا ہے۔

----اکبرؔ جے پوری ----(۱۹۲۸ –۱۹۲۸)

اکبرجے پوری کا اصلی نام سیّد محمد اکبر تھا اور اکبرؔ تخلص کرتے تھے۔ادبی حلقوں میں آپ اکبر جے پوری کے نام سے مشہور و معروف تھے۔آپ کی پیدائش ۲۳ ۱اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جے پور راجستھان میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام آغا سید علی عابدی تھا۔آپ پیشے سے معلم تھے۔آپ کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں آپ کے کشمیر آنے سے پہلے ہی شروع ہوا تھا۔۴ مارچ ۱۹۹۸ء کو سرینگر میں آپ کی وفات ہوئی۔

اکبر جے پوری نے غزلوں کے علاوہ حمد، نعت، مدح اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ بنیادی طور پر آپ کی شاعری میں رومان ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔'شمع فروزاں' ، 'شباب وطن' ، 'سازِ شکستہ' ، ''فکروخیال'' ، اور ''فکروفن'' آپ کے شعری مجموعے ہیں جو آپ کی زندگی میں ہی شائع ہوئے اور تحسین و آفرین کے جملوں سے نوازے گئے۔ ''چمن راز'' اور بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ ''شگوفے'' آپ کی وفات کے بعد شائع کئے گئے اور انہیں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔

۳۔ ----- سوالات کے جوابات -----

ا۔ امن کا پرچار کرنے والوں کی آستینوں میں ظلم، فساد، تعصب، لالچ، خودغرضی اور جھوٹ کے خنجر چھپے ہوئے ہیں۔

۲۔ شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر میں کئی گھروں کے دروازے کُھلے پائے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ہمدرد کے گھر کا دروازہ کون سا ہے اس لئے میں نے کسی بھی دروازے پر صدا نہ دی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بستی میں بے تعصب اور بے مطلب دوست کس جگہ مقیم ہیں اس لئے مایوس ہو کر ہر در سے خالی لوٹا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ شاعر کو اب اچھے لوگ کہیں مِل ہی نہیں پا رہے ہیں۔

----- غزل ------

کس کو معلوم ملے خاک میں منظر کتنے　　　اپنے اپنے چھپائے ہیں سکندر کتنے

اکبر جے پوری دنیا کی ناپائیداری کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا میں کسی چیز کو ثبات اور پائیداری حاصل نہیں ہے۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے بادشاہ آئے اور عالیشان بنگلے بنوائے لیکن اُن کی شان و شوکت مٹی میں مل کر ختم ہوئی ان ہی شخصیات میں اسکندر اعظم بھی تھا جس نے پوری دنیا کو فتح کرنے کا قصد کیا تھا لیکن آخر کار اس کو بھی دنیا چھوڑنی پڑی کیونکہ یہ دنیا کا دستور رہا ہے کہ ہر چیز فناہ ہونے والی ہے۔

تشنہ لب ترسا کئے پیاس لئے آنکھوں میں　　　اور محلوں میں چھلکنے رہے شاعر کتنے

سماجی اور معاشرتی نابرابری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں کہ سماج میں کچھ لوگ اپنی بنیادی ضروریات کے لئے ترستے رہے اور عمر بھر آنکھوں میں پیاس لئے ارمانوں کا خون ہوئے دیکھتے رہئے اور دوسری طرف محلوں میں رہنے والے عیاش لوگ شراب و شباب کے مزے لوٹتے رہیں۔ شاعر نے امیر اور غریب اشخاص کے بیچ میں پائی جانے والی فرق کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

پرچم امن لئے پھرتے ہیں شہروں شہروں　　　آستیوں میں چھپائے ہوئے خنجر کتنے

آجکل کے راہبروں اور پیشواؤں کی اصلیت کو ظاہر کیا ہے اور کہا ہے کی امن کا پرچار کرنے والے بظاہر تو امن کے جھنڈے لئے شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں لیکن وہ یہ سب محض دکھاوے کے لئے کرتے ہیں حقیقت میں تو یہ لوگ اپنے آستینوں میں خنجر چھپائے ہوئے ہیں، یعنی فساد برپا کرنے والے اصل میں یہی لوگ ہیں۔

کس طرح دنیا صدا مجھ کو پتہ یاد نہ تھا　　　یوں تو بستی میں نظر آئے کھلے در کتنے

اکبر فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں بلانا چاہا لیکن مجھے تمہارے نشیمن کا پتہ نہیں تھا یوں تو بستی کے کئی دروازے کھلے تھے لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا مجھے صرف اپنے محبوب کے در کی تلاش تھی جو مجھے نہ مل سکا۔

دیکھ کر تشنہ لبی میری تعجب نہ کرو   میں نے صحراوں کو بخشے ہیں سمندر کتنے

اکبر فرماتے ہیں کہ میری تشنگی کو دیکھ کر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں نے تو صحراؤں کو سینچا ہے اور صحراؤں کو سینچ کر خود پیاسا ہوں یعنی میں نے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا ہے میری تمام کوشش دوسروں کو فضیاب کرنے میں صرف ہوئیں اور خود کی فکر کرنے سے قاصر رہا۔

----- ہمدمؔ کاشمیری -----

ہمدمؔ کاشمیری کا اصلی نام عبدالقیوم خان ہے اور آپ ہمدمؔ تخلص کرتے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۵ اپریل ۱۹۳۷ء کو شہید گنج سرینگر میں ایک اوسط درجے کے خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام نور محمد خان تھا جو پیشے سے ایک تاجر تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں بہ حیثیت افسر ملازم ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان سرینگر باغات برزلہ میں مقیم ہیں اور پوری لگن اور محنت سے زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

ہمدمؔ کاشمیری نے شعر گوئی کا آغاز ۱۹۵۸ء میں کیا۔ کشمیر کے جدید لب و لہجہ کے شاعروں میں آپ صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور نعتیں بھی لکھی ہیں مگر آپ کا ادبی میدان غزل ہی ہے۔ آپ ایک معتبر غزل گو شاعر ہیں۔ آپ نے غزلوں میں ذاتی اور اجتماعی زندگی کے تجربات کو تخلیقی انداز سے پیش کیا ہے۔ آپ کے کلام میں لہجے کا نیا پن اور سلاست دیکھنے کو ملتی ہے۔ آپ کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا جسے آپ نے ''دھوپ لہو کی'' کے نام سے شائع کروایا۔ آپ کی ان غزلوں میں عصری کرب اور ظلم و تشدد کے علاوہ انسانی زندگی کے کئی پہلو فنی پختگی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ ----- سوالات کے جوابات -----

۱۔ شاعر کو اس بات کا گمان نہیں تھا کہ شہر میں ہر طرف علم اور ترقی ہونے کے باوجود ظلم و تشدّد، لاقانونیت اور بے چینی اور بے سکونی کا دور دورہ ہوگا۔

۲۔ یہ شاعر اپنے زمانے کے کرب اور تشدّد کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ میری سرزمین پر کون کے ایسے نشانات لگے ہیں جو کسی بھی بارش سے دھوئے نہیں گئے۔ مطلب یہ کہ میرے وطن میں ایک عرصے سے خون خرابہ جاری ہے اور اس کے ختم ہونے کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی خونِ ناحق کے گرنے میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔

۳۔ صنعتِ تضاد سے مُراد کسی شعر مین دو یا دو سے زیادہ ایسے الفاظ لانا جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے دن رات، اچھا بُرا وغیرہ۔

ہمدمؔ کاشمیری کی دونوں غزلوں میں صنعتِ تضاد والے اشعار درج ذیل ہیں:

۱۔ میرے دائیں بائیں تھیں پرچھائیاں   میرے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہ تھا

۲۔ اس روشنی کے شہر میں ظلمت کرے گی راج
مجھ کو یقین تھا نہ تجھے ہی گُمان تھا

۴۔ شاعر کہتے ہیں کہ رات کو چاند نکلنے کے بعد اُس کی چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے کوئی بھی اپنے چھت پر نہ آیا۔ مطلب یہ کہ سارے شہر میں بے چینی اور ظلم کا ایسا جادو چل گیا تھا کہ خوف و ہراس میں لوگ اپنے گھروں میں جیسے نظر بند ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی چاندنی کا لطف اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ لوگوں کی نظروں نے ایسے دہشت ناک مناظر دیکھے تھے کہ چاندی کے نظارے کو ہی بھول گئے تھے۔

غـــــزل نمـــبــر۱

ایسا نہیں کہ سر پہ سدا آسمان تھا میرا بھی شہر میں کبھی کوئی مکان تھا

شاعر مطلع میں زمانے کے مصائب و آرام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا وطن ہمیشہ ایسا نہیں تھا یہ بھی کبھی ایک خوشحال شہر کی طرح آباد تھا میں باضابطہ اپنے مکان میں رہا کرتا تھا، لیکن اب زمانے کے کرب و بلا سے میرے شہر کی حالت ناگفتی بہ ہوئی ہے اور اس عصری کرب سے میرا مکان بھی مجھ سے چھین لیا ہے اور میں کھلے آسمان تلے بے یارو مددگار رہوں۔

اس روشنی کے شہر میں ظلمت کرے گی راج مجھ کو یقین تھا نہ تجھے کو ہی گمان تھا

عصری کرب کو بیان کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں اس بات کا کسی کو وہم و گمان نہ تھا کہ اس شہر میں تاریکی اور اندھیرے کا راج ہوگا۔ جبر و ظلم، تشدّد، خوف اس شہر کو آگھیرے یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔

دھویا نہیں گیا جو کسی برشگال میں میری زمین پر وہ لہو کا نشان تھا

موجود دور کے ظلم و ستم کی مثال پیش کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں کہ میری سرزمین پر بہت خون بہا ہے جو کس تیز بارش یا طوفان سے دھویا نہیں جا سکتا ہے۔ دنیا میں کتنے جھگڑے تھے جن کا حل نکالا گیا لیکن میری سرزمین پر خون خرابہ بند کرنے کی کوئی صورد کھائی نہیں دیتی ہے۔

ہمدم کو چُپ لگی ہے زمانہ گزر گیا اس شہر خامشی میں میں وہ صاحب اذان تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ ایک عرصہ دراز سے میں خاموش بیٹھا ہوں حالانکہ اس قبرستان نما شہر میں تو وہ لوگوں کو بیدار کر کے فلاح کی طرف بلاتا تھا لیکن حالات نے مجھے وہ صدمے دئے ہیں کہ میں دم بخود ہو کر رہ گیا ہوں۔

غـــــزل نمـــبــر۲

ایک بھی موسم میرے اندر نہ تھا اور آنکھوں میں کوئی منظر نہ تھا۔

شاعر خوشیوں اور امنگوں سے محروم زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں کوئی دلچسپ موسم موجود نہیں ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے کوئی دلکش منظر نہیں ہے۔

میرے دائیں بائیں تھیں پرچھائیاں میرے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہ تھا

انسان کی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں ہر طرف ظلم اور خوف و ستم کی پرچھائیاں تھیں میں ان سے لڑنا چاہتا تھا لیکن ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے میرے ہاتھ میں ایک پتھر بھی نہ تھا یعنی میں بے بس تھا۔

خواب اپنے کیا حقیقت ہو گئے　　　لمس کیسا تھا اگر پیکر نہ تھا

فرماتے ہیں کہ مجھے حقیقت بھی خواب جیسے دکھنے لگتی ہے مجھے لگتا ہے کہ کوئی وجود ہے جو میرے دکھوں اور مصیبتوں کا مداوا کرے لیکن یہ محض احساس ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسا دنیا میں کوئی رفیق اور ہمدم موجود ہی نہیں ہے جو سچ مچ میرے دکھوں کا علاج کرے۔

چھا گیا تھا شہر پر افسوس کوئی　　　چاند جب نکلا کوئی چھت پر نہ تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ میرے شہر میں خوف و ہراس کی وجہ سے لوگ غمگین اور پریشان ہیں اور وہ ایسے خوف زدہ ہیں جیسے کسی نے ان پر جادو کیا ہو۔ اب خوف و ہراس کی وجہ سے چاند نکلنے پر کوئی چھت پر آنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

اک صدا گونجی مکاں میں دیر تک　　　کیا تھا یہ ہمدؔم کوئی در پر نہ تھا

کشمیر کے حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ہمدؔم کاشمیری اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ مکان میں دیر تک کوئی چیختا رہا۔ بظاہر تو دروازے پر کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا دروازے پر کوئی موجود نہ ہونے پر بھی گھر کے اندر چیخیں گونج رہی ہیں۔

نعت

نعت کے لغوی معنی ہیں مدح، تعریف یا ثنا۔ اصلاح میں نعت وہ صنفِ شاعری ہے جس میں پیغمبر اسلام حضرتِ محمد ﷺ کی پاکیزہ سیرت اور صورت کے کسی بھی پہلو کی مدح کی جائے۔ نعت کا تعلق اصل میں عربی اور اُس کے بعد فارسی سے ہے اور فارسی کے توسط سے ہی یہ صنف اُردو میں آئی۔ اسی صنف کی کوئی خاص ہئیت نہیں ہے اس لیے نعت شاعری کی موضوعی صنف ہے۔ نعت لکھنے کے لیے شاعر کے لیے لازمی ہے کہ اُس کے دِل میں حضورؐ کی محبت و عظمت کے جذبات ہوں اور وہ شعوری طور پہ کام کر رہا ہو۔

نعت گوئی کا آغاز دورِ رِسالت میں ہی باقاعدہ طور پر ہوا۔ آپؐ کے دربار میں حضرتِ حسّان ابنِ ثابتؓ نے بار بار آپؐ کی جناب میں نعتیہ اشعار پیش کیے اور آپؐ نے حضرت حسانؓ کو داد و تحسین کے کلمات سے نوازا۔ حضرت کعب ابن زہیرؓ بھی آپؐ کے لیے نعتیہ شاعری کرتے تھے۔ عربی کے بعد فارسی زبان میں بھی نعت گوئی شروع ہوئی اور دنیا کے بڑے بڑے نعت گو شاعر پیدا ہوئے جن میں شیخ سعدی شیرازیؔ، نظامیؔ اور عبدالرحمٰن جامیؔ کافی مشہور ہوئے۔ مثنویوں میں مثنوی نگاروں نے حمد کے بعد نعت لکھنے کا رواج عام کیا۔ ہندوستان میں فارسی نعت گو شعراء میں امیر خسرؔو کا مقام اہم ہے اُردو کے متعدد بڑے شعرا نے نعتیں لکھی ہیں جن میں غیر مسلم شعرا بھی شامل ہیں، میرؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، ماہر القادری اور جدید دور میں احسان محسؔن اور ثاقبؔ نے بری عمدہ نعتیں لکھی ہیں۔

----- رسؔا جاودانی ----- (۱۹۰۱ – ۱۹۷۹)

رسؔا جاودانی کا شمار ریاست کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔آپ کا نام عبدالقدوس تھا اور آپ ۷ جولائی ۱۹۰۱ءکو بھدرواہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام خواجہ منوّر تھا اور وہ ایک تاجر تھے۔آپ نے ابتدائی تعلیم بھدرواہ ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی اور ریاست محکمہ تعلیم میں اُستاد کی حیثیت سے ملازم ہوگئے اور کئی برسوں تک ریاست کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں اُردو اور فارسی پڑھاتے رہے یہاں تک کہ بھدرواہ ہی میں ۲۷ مئی ۱۹۷۹ءکو آپ کا انتقال ہوگیا۔

رسؔا جاودانی کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔آپ کے والد اگرچہ تجارت پیشہ تھے مگر علم وادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔چنانچہ والد صاحب کی پشت پناہی سے آپ اسکول کے زمانے سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔شاعری کے ساتھ ساتھ آپ کو گانے بجانے سے بھی اچھی دلچسپی تھی جس نے آپ کے شعری ذوق کو دوبالا کردیا تھا۔آپ بنیادی طور روایتی شاعر تھے۔اپنی شاعری میں اردو اور کشمیری شعراء کی پیروی کرتے تھے لیکن بعض جگہ آپ کی غزلوں اور نظموں میں نیا پن نظر آتا ہے۔آپ کی غزلوں کا خاص موضوع حُسن وعشق ہے تاہم آپ نے انسانی زندگی کے تعلق سے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔آپ کشمیری زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور مشہور کشمیری شاعر رسول میرؔ کو آپ نے اپنا معنوی اُستاد مانا ہے آپ نے غزلوں میں عموماً چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے جن سے اُن میں ترنم پیدا ہوا ہے۔آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔جن میں ''لالہ صحرا ۱۹۴۸ءمیں اور ''نظم ثریا ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئے اور کافی مقبولت پائی۔

۳۔ ------ سوالات کے جوابات -----

ا۔ حضرت محمدؐ امن اور سلامتی کا پیغام لے کر آئے۔وہ قرآنِ پاک لائے جس میں انسانیت کی بہبودی اور سلامتی کا پیغام ہے۔

۲۔ شاعر نے حضورؐ کو ایک خوبصورت اور سایہ دار درخت سے تشبیہ دی ہے جس کا دامن میں بیٹھ کر ہر بے چین اور مضطرب دل کو سکون آجاتا ہے اگرچہ آپؐ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا مگر آپ کی رحمت کا سایہ پورے عالم پر چھایاہُوا ہے۔

٤۔ ----- مُسدّس -----

مُسدّس ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں چھ چھ مصرعوں کے بند ہوں۔ان چھ مصرعوں میں پہلے چار مصرے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور باقی کے دو مصرعوں کا قافیہ الگ ہوتا ہے عموماً یہ ہئیت پابندِ نظم یا مرثیہ کے لیے استعمال کی گئی ہے۔اردو کے متعدد شاعروں نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔اس ہئیت کو پہلی بار مرزا، سوداؔ نے مرثیہ لکھنے کے لیے استعمال گیا اور بعد میں اسی ہئیت میں مرثیہ لکھا جانے لگا۔مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے اسی ہئیت میں اُردو کے کامیاب مرثیے لکھے ہیں۔مولانا حالیؔ کی ''مسدّس مدّ وجزر اسلام'' اور علاّمہ اقبالؔ کی ''شکوہ'' اور جوابِ شکوہ بھی مسدّس ہی کی شکل میں ہے۔

۵۔ ----- خلاصہ -----

شاعرعبدالقدوّس رسؔا جاودانی نے اس نعت میں حضورؐ کو خراجِ عقید پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپؐ کی آمد سے ہی غمگین دِلوں کو قرار آ گیا۔ آپؐ کو اللہ نے تمام عالموں کی زینت بنا کر بھیجا۔ آپؐ تمام پیغمبروں کے سردار بن کر آئے۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس بہت ہی پاکیزہ اور آپؐ کے عادات اطوار بھی سب سے زیادہ بُلند تھے۔ دُنیا بھر کی نگاہیں آپؐ کے انتظار میں تھیں۔ آپؐ نے آ کر آدمیت کو فرشتوں سے افضل مقام دِلایا۔ آپؐ رحم و کرم کے بادل تھے اور ہر آن برستے رہتے تھے۔ آپؐ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا مگر آپؐ کی رحمت کا سایہ پورے عالم پر پڑتا تھا۔ زمین کی قدر د قیمت عرش سے بھی بڑھ گئی اور آپؐ کے آنے سے پوری دنیا کو ایک وقار مل گیا آپؐ کو اللہ نے قرآنِ مقدس سے نوازا جس میں ساری انسانیت کے لیے امن اور سلامتی کا پیغام ہے۔ آپؐ ہر ایک سے اچھا سلوک فرماتے تھے اور یہی تعلیم آپؐ نے سب کو دی دُنیا میں بُلند مقام اُسی کو ہے جو خدا سے جتنا زیادہ قریب ہے لوگ آپؐ سے گہری عقیدت رکھتے ہیں اور آپؐ کے کردار کو دیکھ کر ہر کوئی آپ کی شان اور عظمت کا قائل ہے۔

سبق نمر ۱۲ مرثیہ

مرثیہ لفظ ''رثا'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رونا یا ماتم کرنا۔ اصطلاحِ شعر میں مرثیہ سے مراد ایسی نظم ہوتی ہے جسمیں کسی مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اس کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا جائے۔ مسعود حسین رضوی صاحب لکھتے ہیں۔

''مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اُس کی موت پر افسوس کیا جائے اردو میں با لخصوص مرثیہ کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں حضرت امامِ حسینؓ کی شہادت یا اس کے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جا ئے''۔

جبکہ دوسرے لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔ جسے حالی کا مرثیہ، غالب، اقبال کا مرثیہ، داغ وغیرہ۔ میر ضمیر نے مرثیے کیلئے جو اجزاء ترکیبی متعین کئے وہ حسب ذیل ہیں۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین۔ اردو میں انیسؔ و دبیرؔ نے اس صنف کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔

مرثیہ کے اجزاء ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱)۔ چہرہ:۔ اس میں موسم ' دنیا کی بے ثباتی ' سفر کے مصائب کا بیان ہوتا ہے۔

(۲)۔ سراپا:۔ اس میں ہیرو کی قد و قامت' خدوخال کا بیان ہوتا ہے۔

(۳)۔ رخصت:۔ اس میں ہیرو کا امام حسینؓ اور باقی عزیزوں سے رخصت کا بیان ہوتا ہے۔

(۴)۔ آمد:۔ اس میں ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آنا بیان ہوتا ہے۔

(۵)۔ رجز:۔ اس میں ہیرو کی زبان سے اپنی مہارت اور بہادری کا بیان ہوتا ہے۔

(۶)۔ جنگ:۔ اس میں بالکل جنگ کے دوران مقابلے کا بیان ہوتا ہے۔

(۷)۔ شہادت:۔ اس میں ہیرو کا زخمی ہو کر شہید ہونے کا بیان ہوتا ہے۔

(۸)۔ بین:۔ اس میں ہیرو کی لاش پر اس کے اعزّہ کا صبر عورتوں کے رونے اور ماتم کرنے کا بیان ہوتا ہے۔

----- مرزا سلامت علی دبیرؔ ----- (۱۸۰۳ – ۱۸۷۵)

اردو مرثیہ میں نئی روح ڈالنے والے مرزا سلامت علی دبیرؔ ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا اور آپ کا خاندان ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان میں مقیم ہُوا تھا۔ جب دہلی تباہ ہوئی تو آپ اپنے والد کے ساتھ لکھنو چلے آئے اور پھر ساری اندگی لکھنو ہی میں گذاری۔ آپ بچپن سے ہی کافی ذہین تھے اور شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ لکھنو میں آپ نے جید علماء سے تعلیم و تربیت پائی جن میں غلام ضامن اور مرزا کاظم علی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ابھی آپ کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ آپ نے میر مظفر حسین ضمیرؔ کی شاگردی اختیار کی اور مرثیہ نگاری میں کمال حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب پورے ہندوستان میں حالات ابتر تھے تو آپ نے سکون کی تلاش میں پٹنہ، مرشد آباد اور عظیم آباد کا سفر کیا لیکن ہر جگہ مایوس ہی ہوئے۔ آخری عمر میں بینائی کمزور ہوگئی اور اس دوران میر انیسؔ کا انتقال ہوا۔ آپ کو اُن کی موت کا بڑا غم لگا اور تین مہینے بعد ۱۸۷۵ء ہی میں آپ کا بھی انتقال ہوا۔

مرزا دبیرؔ نے بہت چھوٹی عمر سے ہی شعروشاعری کا آغاز کیا۔ پہلے پہل غزل گوئی کرتے رہے لیکن بعد میں میر ضمیرؔ کی شاگردی میں مرثیہ نگاری کی طرف خاص دھیان دیا اور اس فن میں اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ گئے۔ زبان کی صفائی اور شعر کے ظاہری حسن کے لحاظ سے آپ کا کلام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی شاعری پر مذہبیت کی گہری چھاپ ہے آپ نہایت زود گو شاعر تھے۔ مرثیہ نگاری کے علاوہ آپ نے مثنویاں، قصائد، رباعیات اور قطعات بھی کافی تعداد میں تصنیف کئے۔ آپ اور میر انیسؔ ایک ہی وقت میں مرثیہ نگاری کے دو باکمال شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں میر انیسؔ سے زیادہ تشبیہات اور استعارات موجود ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ''دفترِ ماتم''، ''رباعیات دبیرؔ''، ''ابواب المصائب'' اور ''رسالہ مرزا دبیرؔ'' قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے کئی شاگرد ہوئے جن میں منیرؔ شکوہ آبادی، شادؔ عظیم آبادی، صغیرؔ بلگرامی اور مرزا اوجؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۳۔ ----- سوالات کے جوابات -----

ا۔ حضرتِ امام حسینؓ نے یزیدی فوج سے اپنے چھ ماہ کے بچے علی اصغر کے لئے پانی مانگا جو ایک ہفتے سے پانی کے لئے ترس رہے تھے۔

۲۔ ----- خلاصہ -----

مرزا دبیرؔ اس مرثیہ میں نہایت مؤثر انداز میں یزیدی فوج سے پانی مانگنے کا واقع بیان کیا ہے۔ کربلا کی جنگ میں چونکہ حضرت امام حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں پر شدت کی گرمی میں پانی بند کر دیا گیا تھا ایسے میں اُن کے اپنے چھ ماہ کے بیٹے علی اصغرؑ کو جب پیاس نے بے حس کر دیا تو حضرت امام حسینؓ نے اُسے گود میں لیکر یزیدی فوج کی طرف بڑھنا شروع کیا تا کہ اس معصوم بچے کے لئے اُن سے پانی مانگیں۔ جاتے جاتے حضرت امام حسینؓ اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے کہ میں اس معصوم کو لیکر چلا تو ہوں مگر دشمنوں سے کیا کہوں گا۔ نہ مجھے سوال کرنا آتا ہے اور نہ ہی کوئی درخواست کرنی آتی ہے چلتے چلتے جب دشمن کی فوج کے قریب پہنچے تو نظریں جُھکائے اور شرمائے ہوئے تھے اُنہیں اپنی غیرت دشمن کے سامنے دامن پھیلانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ بہر حال انہوں نے علی اصغر کے چہرے کی طرف دیکھا اور دشمنوں سے کہنے لگے کہ میں اس معصوم کی خاطر آپ سے پانی مانگنے آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے قصور وار ٹھہراتے ہیں مگر یہ

معصوم تو قصوروار نہیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہ چھ ماہ کا بچہ پیاسا ہے۔تم خوب جانتے ہو کہ یہ کس کی اولاد میں سے ہے۔ میں تم کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس بچے کے لئے تھوڑا پانی دے دو۔ اگر تم پانی دو گے تو تمہارا نام مشہور ہو جائے گا اور یہ ثواب کا کام بھی ہے یہاں تک کہنے کے بعد حضرت حسینؓ نے اپنے بیٹے کے ہونٹ چوم لئے اور اپسی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے پانی مانگنے کے لئے سب کچھ کہہ دیا ہے۔اب میرے پاس ان سے سوال کرنے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں اس لئے اب تم بھی اپنی سوکھی زبان دشمنوں کو دکھا دو شاید کہ اُنہیں تم پر ترس آ جائے۔ ایسا سنتے ہی علی اصغر نے اپنی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھیر دی۔ یہ سب دیکھ کر حضرت حسینؓ تڑپ اٹھے اور اللہ سے رحم کی التجا کرنے لگے۔

----- سوال نمبر ۳ ----- یہ بند مرزا سلامت علی دبیؔر کی اُس مرثیہ سے لیا گیا ہے جس میں شاعر نے حضرت حسینؓ کو اپنے بیٹے علی اصغر کے لئے یزیدی فوج سے پانی مانگتے ہوئے دکھایا ہے۔ حضرت حسینؓ دشمنوں سے کہتے ہیں کہ تمہیں معلوم بھی ہے اس بچے کا حسب ونسب کیا ہے اور یہ کون سا ہیرا ہے؟ یہ تو بے بس اور غمگین بانو کا بیٹا ہے اُس کے جگر کا ٹکرا ہے۔تم لوگوں کو میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ بات مان لو یعنی اس معصوم کی پیاس بُجھانے کے لئے پانی دے دو۔ دیکھو یہ عرب کا شاہزادہ ہے اور تم سے پہلی بار کوئی سوال کر رہا ہے۔تم حضرتِ علیؓ کو خوب جانتے ہو یہ تو انہیں کا پوتا ہے اور تم سے چند گھونٹ پانی مانگتا ہے۔تم پانی دے دو اور اپنے لئے ناموری حاصل کرو۔تمہارا نام اچھے سے نکل آئے گا اور تم لوگ خوب جانتے ہو کہ کسی پیاسے کو پانی پلا دینا ثواب کا کام ہے۔

ترکیب نحوی (علم نحو)

کسی جملہ میں الفاظ باہمی تعلقات کے ظاہر کرنے کو ترکیب نحوی کہتے ہیں۔

جملہ کی چار قسمیں ہیں:۔

جملہ لفظوں کا وہ مجموعہ ہے جس سے کہنے والے کا مطلب سننے والے کو سمجھ میں آ جائے۔

معنی کے لحاظ سے جملہ کی دو قسمیں اور مسند کے لحاظ سے جملہ کی دو قسمیں ہیں۔

معنی کے لحاظ سے:۔ جملہ انشائیہ اور جملہ خبریہ۔

مسند کے لحاظ سے:۔ جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ۔

جملہ انشائیہ:۔ جس سے کوئی حکم ، یا استہفام ' تعجب یا انبسات وغیرہ ظاہر ہو۔ جیسے۔ تمہارا نام کیا ہے۔(استفہامیہ) دروازہ بند کرو۔(حکم)

جملہ خبریہ:۔ جس میں کوئی واقعہ یا حالت طاہر ہو۔ جیسے عابد چلا گیا ' اسلم نے قلم خریدا۔

جملہ اسمیہ:۔ جس میں مسند اور مسند الیہ دونوں اسم ہو۔ جیسے اسلم ایک نیک آدمی ہے۔
بلبل ایک پرندہ ہے۔

نوٹ:۔ مسند:۔ علم نحو میں خبر کو کہتے ہیں

مسند الیہ:۔علم نحو میں مبتدا کو کہتے ہیں۔(جملہ اسمیہ کا پہلا جز جس کے متعلق کوئی خبر دی جائے)

جملہ فعلیہ:۔جس میں مسند الیہ اسم اور مسند فعل ہو۔جیسے۔اسلم نے خط لکھا

فعل ناقص:۔وہ فعل جس کا فاعل اور مفعول معلوم نہ ہوں بلکہ وہ اسم اور خبر کا خواہاں ہوں۔

فعل مجہول:۔وہ فعل جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔

مضاف الیہ:۔وہ اسم جس کے ساتھ کوئی دوسرا اسم منسوب کیا جائے۔(پھول جیسے رخسار)

مضاف:۔جو کسی دوسرے اسم کے ساتھ لگایا جائے۔ جیسے۔اسلم کی کتاب ، احمد کا قلم

ترکیب نحوی کرنے سے پہلے درج زیل باتوں کا جان لینا ضروری ھے ۔

جملہ اسمیہ کے مسند الیہ کو "مبتدا" یا "اسم" کہتے ہیں۔اس کے مسند کو "خبر" کہتے ہیں۔اس کے علاوہ جتنے بھی الفاظ جملے میں آئے ہیں انکو 'متعلق خبر' کہتے ہیں

جملہ فعلیہ:۔میں مسند الیہ کو "فاعل" کہتے ہیں۔جس پر فعل واقع ہو۔اسکو مفعول اور فعل کے ساتھ تعلق رکھنے والے کلمات کو "متعلق فعل" کہتے ہیں۔

جملہ اسمیہ:۔اس جملہ میں پہلے فعل پہلے فعل ناقص پھر مبتدا یا اسم پھر خبر اور پھر متعلق خبر کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔مثلاً اسلم بڑا عقلمند ہے۔

جملہ اسمیہ خبریہ:۔	ہے	اسلم	عقلمند	بڑا
	فعل ناقص	مبتدا (یا اسم)	خبر	متعلق خبر

جملہ فعلیہ میں سب سے پہلے فعل بتایا جائے پھر فاعل پھر مفعول اور پھر متعلقات۔مثلاً اسلم نے سبق پڑا۔

جملہ فعلیہ:۔	پڑھا	اسلم	نے	سبق
	فعل	فاعل	علامت فاعل	مفعول